International Journal of Islamic Studies & Culture *ISSN-2709-3905*
http://ijisc.com.pk/index.php/IJISC/issue/view/701 *PISSN2709-3891*
(Volume.4, Issue.2 (2024)
(April-June)

The Thoughtful and Prosodic Review of "Mushtaq Aajiz Doha"

مشتاق عاجز کے دوہوں کا فکری و فنی جائزہ

Nausheen Shokat
Scholar, Department of Urdu, AIOU, Islamabad.
Dr. Abdul Sattar Malik
Lecturer, Department of Urdu, AIOU, Islamabad.

The Couplet (Doha) is an old genre of poetry of the subcontinent, which has completely Hindi's style. This genre of poetry begins with the beginning of Urdu language. Anyway! Among the Urdu couplet writers, the first couplet is written by Meeran jee Shamsul-Ishaq. After the, Meeran jee Shamsul-Ishaq many Urdu poets of saying Couplets (Doha) came forward, including in which Amir Khusro's name is also worth mentioning. In this research article, the thoughtful and prosodic review of Mushtaq Aajiz's Dohay (Couplets), have been taken, which are included in his book titled as "SAMPORUN's".

Key words- Couplet, prosodic, verses, poets, Mushtaq Aajiz, Samporun.

کلیدی الفاظ: دوہا، عروض، اشعار، شاعر، مشتاق عاجز، سمپورن

مشتاق عاجز(پ: یکم اپریل،1944ءاٹک)،اردو اور پنجابی زبانوں کے معروف شاعر،ادیب اور ماہرِ تعلیم ہیں ، آپ کے اب تک، پانچ متنوع صنفِ ادب میں لکھے گئے،شعری مجموعے شایع ہو چکے ہیں ۔جن میں اردو نظم وغزل ، اردو گیت ، اردو دوہے اور پنجابی نظم و غزل شامل ہیں ،آپ ،خوب صورت اور عمدہ دوہے لکھتے ہیں ،آپ کی دوہوں پر مشتمل کتاب "سمپورن"(مطبوعہ:۲۰۱۱ع)میں شامل دوہوں کو موسیقی کی درج ذیل دس(۱۰)اصطلاحات کی تحت تقسیم کیا ہے:۔

۱۔کھرج ۲۔رکھب ۳۔گندھار ۴۔مدھم ۵۔پنچم ۶۔دھیوت ۷۔نکھاد
۸۔الاپ ۹۔استھائی ۱۰۔انترہ

نیز،مذکورہ موسیقی کی ہر اصطلاح کے تحت بیس،بیس(۲۰،۲۰)دوہے شامل ہیں اس طرح کل دوہوں کی تعداد دو سو(۲۰۰)بنتی ہے۔ہر بیس(۲۰) دوہے،ایک ہی خیال اور رنگ کے ہیں اس لیے ان کو مزید دس(۱۰)ذیلی عنوانات میں منقسم کیا گیا ہے۔پہلے بیس(۲۰)دوہے،مذہب،دھرم،معرفت اور عرفان کے حوالے سے ہیں،اس لیے ان پہلے بیس(۲۰)دوہوں کا ذیلی عنوان "دھرم اشلوک" رکھا گیا ہے۔اس کے بعد،اگلے بیس(۲۰)دوہے،مٹی سے محبت اور مٹی پرمان کے حوالے سے ہیں اس لیے،ان کا ذیلی عنوان "ماٹی مان" رکھا گیا ہے۔ان سے اگلے بیس(۲۰)دوہے،حرص وہوس،دولت،زر،بیوپار اور لین دین کے حوالے سے ہیں،اس لیے ان کا ذیلی عنوان "مایا موہ" رکھا گیا ہے۔اگلے بیس (۲۰) دوہے ،مسافت، نیل گگن،کھیت،کھلیان اور نیند کے حوالے سے ہیں اور ان کا ذیلی عنوان "دھیان دھارا" ہے۔ان سے اگلے بیس(۲۰) دوہے،لوبھ (ہوس)، محبت،جوت،گیان،پاپ اور رسیلے بول کے حوالے سے ہیں اور ان ذیلی عنوان "گیان گیتا" ہے۔ان سے اگلے بیس(۲۰) دوہے،حسن، خوب صورتی،روپ سروپ،جسم اور جان کے حوالے سے ہیں اور ان کا ذیلی عنوان "روپ سروپ" ہے۔اگلے بیس(۲۰) دوہے، گریہ وزاری،فراق اور وصل کے حوالے ہیں اور ان کا ذیلی عنوان "برہن بین" ہے۔اگلے بیس(۲۰) دوہے،سہاگن، جیون، پریم، محبت اور قسمت کے حامل خیالات رکھتے ہیں اور ان کا ذیلی عنوان "پریم پنتھ" رکھا گیا ہے۔اگلے بیس(۲۰) دوہے،چین،دکھ، من،بسنت،سنسار،پورن ماشی(چودھویں کا چاند)اور گھور اندھیرے کے مفاہیم لیے ہوئے ہیں اور ان کا ذیلی عنوان "بجوگ روگ" ہے۔آخری بیس(۲۰) دوہے،وصل،ملاپ،سگائی اور رقص کے حوالے سے ہیں اور ان کا ذیلی عنوان "سنجوگ" رکھا گیا ہے۔

مشتاق عاجزؔ نے ان دوہوں کو (۱۰) ابواب میں بلحاظ عنوان تقسیم کیا ہے بل کہ ہر عنوان کے تحت بیس (۲۰) دوہوں کے اختتام پر ان کا آغاز کیا ہو اور ہر عنوان کے صفحہ کے دوسری طرف مشہور و معروف پنجابی شعرا اور صوفیا کا ایک، ایک شعر بھی دیا ہے، ان اشعار کے فوراً بعد بہ طورِ فصل (ہر عنوان کے بعد) اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی ایک، ایک تصویر بھی دی ہے اس طرح کتابِ ہذا میں کل دس (۱۰) تصاویر بھی شامل ہیں، جن مشہور و معروف پنجابی شعرا اور صوفیا کے اشعار، ہر عنوان کے بعد، شامل ہیں، ان میں سے کبیر داس، بابا فرید شکر گنجؒ، سلطان باہوؒ۔ ڈاکٹر طاہر سعید ہارون، جلال میر زاخانی، پرتو روہیلہ، شاہ حسین، خواجہ فریدؒ اور بُھلے شاہؒ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ اب ہم مشتاق عاجزؔ کی کتاب ''سمپورن'' میں شامل دوہوں کی فکری اور موضوعاتی جہات کو زیرِ بحث لاتے ہیں:۔

فکری اور موضوعاتی تجزیہ:۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ دوہے نے برصغیر پاک و ہند کے عوامی طبقے میں جنم لیا۔ اسی باعث اس مقبولِ عام صنف کی موضوعاتی گہرائی اور تنوع لامحدود نہیں ہونے پائی۔ برصغیر کا عوامی میدان زیادہ تر عارفانہ مضامین کی طرف راغب پایا گیا ہے۔ اسی نسبت سے دوہے کا غالب موضوع تصوف اور روحانیت ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ عوامی مزاج کے پیشِ نظر یہاں کے ہندو، سکھ اور مسلمان روحانی پیشواؤں نے اپنا کیفیاتی پیغام عوامی ذہن میں راسخ کرنے کے لیے جن اصنافِ اظہار کو اپنایا ان میں دوہا تقریباً اولین صنفِ سخن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے جہاں انھیں پیغام کی آسان ترسیل میسر آئی، وہیں اس صنفِ سخن کو فروغ بھی ملا۔ انگریزی تسلط کا زمانہ آیا تو عوامی مسائل کی نوعیت بھی بدلی اور لا محالہ ادبی اصناف بھی متاثر ہوئیں۔ یہ دور کئی لحاظ سے دوہے کے لیے تعطّل کا دور کہلایا جا سکتا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد دوہے کو نئے سرے سے پنپنے کا ماحول ملا تو، اس صنف نے موضوعاتی حوالے سے بہت کم تنوع کو قبول کیا۔ تصوف کے علاوہ دوہے کے دیگر مرغوب موضوعات میں قصائدِ حسن علاقائی تہوار، بدلتے موسم، جوانی کی امنگ، انتظارِ محبوب، وصال کی ساعتیں، ہجر و فراق کے دکھ اور سماجی محاسن و معائب شامل ہیں۔ ''سمپورن'' کا دوہا بھی کم و بیش ان تمام موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ بادی النظر اس کے ابواب کی تقسیم بہ لحاظِ موضوع محسوس ہوتی ہے، تاہم کہیں کہیں جواز کے تحت عنوانات سے ہٹ کر بھی دوہے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ تصوف کی بحث، وہ عنصر اور جوہرِ خاص ہے جو دیگر عنوانات کی ذیل میں بھی اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ تاہم، ''سمپورن'' میں شامل دوہوں میں بیان کردہ موضوعات اور جہاتِ مضامین حسبِ ذیل ہیں:۔

❖ **توحید و رسالت:۔**

باب اول میں شامل دوہے، توحید اور رسالت کے بیان پر مشتمل ہیں۔ توحیدِ خالص پر یقین کو اکتارے کی علامت سے واضح کیا گیا ہے۔ اکتارہ نہ صرف اپنے نام سے، بل کہ بجنے کی آواز سے بھی توحید ہی کی کہانی سناتا ہے۔ خالقِ کائنات کی وحدانیت ہی سے ''کن'' کے کرشمے پھوٹے اور یوں اکتارے کا سنگیت سات سروں کا دھارا بن کر ظہور میں آیا۔ امرِ ''کن'' کو سر تال کے استعارے سے پیش کیا گیا ہے۔ روح و بدن کی دوئی کا یکجا ہونا ایسا معجزہ ہے جو امرِ ''کن'' کے سبب ہی سے ممکن ہو سکے گا۔ اس حوالے سے مشتاق عاجزؔ ''سمپورن'' میں یوں رقم طراز ہیں:۔

اکتارے کی دُھن سے پھوٹا کن کا سُر سنگیت ؎
کن ہے سات سروں کی دھارا، کن ہی اتم گیت (۱)

امرِ ''کن'' کی تلمیح کو بہ طور علامت سامنے رکھ کر کائنات میں انسان کی مرکزی حیثیت کو پیش کیا گیا ہے۔ انسان کا دیگر مخلوقات پر شرف یہ بتاتا ہے کہ اسے نیکی اور تفکر کی توفیق عطا ہوئی ہے۔ یعنی انسان کے خلقی فضائل، کائنات میں یوں ہیں جیسے ''کن'' کے راگ میں چاشنی بھرنے والے امدادی سر ہوں۔ تکثیر میں توحید کا مشاہدہ بھی تصوف کا اہم مرحلہ ہے اور اس کو بھی اکتارے کی دھن پر رقص کرتی ہوئی مخلوقات کا نظارہ بتلا کر بیان کیا گیا ہے۔ گویا ہر پہلو، ہر جہتِ کائنات پر اکتارے کا ہی سکہ چلتا ہے۔ توحید جیسے حساس موضوع پر بات کرتے ہوئے دوہے کا لہجہ اثباتی رہتا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کے یہ واقعی صوفیانہ اور سالکانہ صنف ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ناچ رہا ہے اکتارے کی دُھن پر سب سنسار ؎
ہر دیکھی ان دیکھی سے میں باج رہا اک تار (۲)

حال آں کہ اسی موضوع پر غزل کا لہجہ استفہامیہ ہو جاتا ہے:۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود ؎
پھر یہ ہنگامہ اے خدا! کیا ہے؟ (۳)

مصائب و آلامِ حیات سے تنگ آ کر غالب نے کچھ اس طرح بھی کہا ہے:۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے !(۴)

غزل، نظم جیسی اصناف میں قصہ من و تو میں سارا زور فن کی بلندیٔ آہنگ پر رہتا ہے جب کہ دوہے کا اندازِ اظہار یہ ہے کہ ''میں ناہیں سبھ توں''۔اس حوالے سے مشتاق عاجزؔ ''سمپورن'' کے آغاز میں ''میں ناہیں سبھ توں'' کے عنوان کے تحت،اپنے دیباچے میں اس کا اظہار یوں کرتے ہیں:۔

''اے ربِ رحیم ! تیرا یہ عاجز بندہ تیرے احسانات کا شکر بجالاتا ہے۔اے شعروں، تصویروں اور سُروں کا شعور بخشنے اور ''سمپورن'' مرتب کرنے کی توفیق دینے والے !اے لفظوں، لکیروں اور رنگوں کی زبان سمجھنے والوں کے خالق ! یہ بندۂ حقیر بصد عجز و نیاز اقرار کرتا ہے کہ ''میں ناہیں سبھ توں''۔''(۵)

سمپورن کے دوہے نے ''کن'' کو بھید قرار دیا ہے جس کی اصل جان کر غوث، قطب، ابدال، اوتار اور پیغمبر کامیاب و کامران ٹھہرے۔یہ راز گویا کئی پہلوؤں سے تصرف بخش ہے اسی لیے تاکیداً کہا گیا ہے کہ:۔

جب تک تن کا تُونبا باجے پی کا راگ الاپ

جس نے من کا تار بجایا نام اسی کا جاپ(۶)

باب اول کا دوسرا حصہ گویا رسالتِ مآبؐ کی شان میں قصیدہ ہے۔آپؐ کے حسنِ ظاہر و باطن کا اقرار، سچی عبودیت کا اعتراف، کائنات کی سروری کا اثبات، صداقت و امانت کی گواہی، اسوۂ حسنہ کی شان داری اور آپؐ کے اہل بیت کے جود و سخا اور فضیلت کو سلام پیش کیا گیا ہے۔اہل بیت میں مقام علی اور شانِ حسینؓ کو الگ سے بیان کر کے اظہارِ عقیدت کیا گیا ہے۔حضرت علیؓ کی شان کے حوالے سے مشتاق عاجزؔ یوں کہتے ہیں:۔

علم نگر ہے نام تمہارا، در کا نام علیؓ

جو اس در کا سیوک سائیں، اس کی جون بھلی(۷)

جب کہ حضرت امام حسینؓ کے حوالے سے شعر ملاحظہ ہو:۔

سِیس کٹا کے جیتا تھا جو پر میشور کا نام

اس کے نام پہ میں بلہاری، اس کو مرا پرنام(۸)

یہاں پر، پہلے باب ''کھرج'' جس کا ذیلی باب ''دھرم اشلوک'' ہے، کا اختتام ہوتا ہے، اس باب میں توحیدِ خالص، ''کن فیکون، تخلیقِ کائنات، حمد و ثنا، حضور اکرمؐ کی رسالت، حضور اکرمؐ کے القاب صادق اور امین، آپؐ کا اسوۂ حسنہؐ، شانِ علیؓ اور مقامِ حسینؓ جیسے، موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔اس کے بعد، دوسرا باب ''رکھب'' جس کا ذیلی باب ''ماٹی مان'' ہے، کا آغاز ہوتا ہے:۔

❖ خودی کی بنیاد:

خودی کی اصطلاح ایک طرف تو علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ جیسے فلسفی، حکیم اور شاعرِ مشرق نے مثالیں بدل بدل کر اپنے کلام میں استعمال کی ہے، دوسری طرف روایتی عارفانہ کلام میں خودی کا اجمال بیان، روح و بدن یا خاک و نور جیسی تماثیل کے ضمن میں کیا گیا ہے۔''سمپورن'' کے بابِ دوم میں ''ماٹی مان'' کے تحت دیے گئے دوہے بھی فلسفہ خودی کا عام فہم اور آسان بیانیہ پیش کرتے ہیں۔اپنی مضبوط اور متوازن جسمانی ساخت پر انسان بسا اوقات گھمنڈ اور ناز کا شکار ہو جاتا ہے۔ایسے میں ''سمپورن'' کا دوہا اشارہ دیتا ہے کہ غرور اور تکبر کا احساس تک بھی آدمی کو روا نہیں ہے کیوں کہ اس کی توفیقِ احساس بھی تو عظیم قدرت کی عطا کردہ ہے، لہذا تکبر خالقِ کائنات ہی کو زیبا ہے۔خودی کی عمارت بے وقعتی اور بے بسی کی بنیاد پر استوار ہو تو مظبوط ہوتی ہے۔آب و گل کا پتلا اگر کائناتی قوتوں کی تسخیر کر پایا ہے تو اس ایجاد کی ماں بھی وہی ضرورت ہے جسے بنیادی انسانی کم مائیگی ساتھ لائی ہے۔اپنی کمزوری اور بے بساطی کا درست ادراک کر کے انسان اپنی بقا کی جنگ لڑنی شروع کرتا ہے اور جمادات و نباتات کو تصرف میں لاتا ہے۔اسی بات کو علامہ محمد اقبالؒ نے اپنی نظم ''احکامِ الٰہی'' کے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے:

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات

مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند(۹)

یا خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے(۱۰)

بہر حال "سمپورن" کا دوہا، موضوع سے انصاف کرتے ہوئے نچوڑ پیش کرتا ہے کہ مٹی کو اپنی بچھے رہنے کی فطرت نہیں چھوڑنی چاہیے۔ یعنی، مٹی کو عاجز ہی رہنا چاہیے، یہی عاجزی ہے جس نے مٹی کے اس پتلے کو اشرف المخلوقات بنایا، یہی انسان آج ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ آدمی کی آدمیت اپنا عمودی سفر شروع ہی اس اصول پر کرتی ہے، جس اصول پر مٹی اپنی زرخیزی کے جوہر دکھاتی ہے، پہلے اپنے آپ کو مٹانا پڑتا ہے، اس کے بعد شہرت اور ناموری انسان کا مقدر ہو جاتے ہیں۔ جتنے بھی بڑے بڑے اور نام ور لوگ گزرے ہیں انھوں نے پہلے اپنی ہستی کی نفی کی ہے۔ اسی مضمون کو سید غلام محمد مست کلکتوی نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ یوں باندھا ہے:۔

؎ مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہیے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے(۱۱)

جب کہ علامہ محمد اقبالؒ ہی کے اس مصرعے "ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی" کی تائید میں مشتاق عاجزؔ نے کچھ یوں کہا ہے:۔

؎ ماٹی کو گلزار بنالے، بیج لگن کا بو
آنکھوں سے برساوہ برکھا، ماٹی جل تھل ہو(۱۲)

خودی کی عظمت اور منزلت کی طرف اشارہ بعد میں دیا گیا ہے اور پہلے خود کو مٹی میں ملانے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ جس طرح مٹی سے زرخیزی کے کرشمے رونما ہوتے ہیں اور اسی بے رنگ و بو مٹی سے انواع و اقسام کے رنگ، ذائقے یا خوشبوئیں جنم لے سکتی ہیں۔ اسی طرح مٹی کا پتلا یعنی انسان بھی کائناتی عوامل میں تصرف کرنے کا اہل ہے اور زور عقل و جسم سے حالات کا رخ موڑ سکتا ہے۔ مٹی کی دوسری یہ خوبی بیان ہوئی ہے کہ اگر درست مٹی کو گوندھ کر چاک پر چڑھایا جائے تو یہی مٹی دیے بھی روشن کرتی ہے اور جام جہاں نما کا روپ بھی دھار لیتی ہے۔ آدمی بھی عرفانِ ذات سے گزر جائے تو انمول ٹھہرتا ہے اور اس راہ پر چلنے کی جرات رندانہ شخصی ہوتی ہے۔ جیسا کہ علامہ محمد اقبالؒ نے اپنے ایک شعر میں اس کا اظہار یوں کیا ہے:۔

؎ اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن(۱۳)

خاک کی معراج یہ بتاتی ہے کہ اسے انسانی کالبد کا بنیادی عنصر پہنایا گیا ہے اور انسان فی نفسہ، اشرف المخلوقات ہے۔ چہ جائیکہ تزکیۂ نفس کے مراحل سے گزر کر اپنے اندر کو صیقل کر لے۔ انسان اگر انسانیت کی اصل سنبھال پائے تو اس کا جسدِ خاکی بلاشبہ مٹی کا مان ہے، جو فرشتے سے بڑھ کر ہے، بقول الطاف حسین حالیؔ:۔

؎ فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ(۱۴)

موضوع کا پہلو بدل کر اسی جسم کو کچے مکان سے تشبیہ قرار دی گئی ہے اور روح کو کرۂ ارضی میں مہمان بنا کر بھیجا گیا ہے، اس تمثیل سے طبعِ انسانی کو دعوت دی گئی ہے کہ روح کا مہمان، جس ذات نے بھیجا ہے، اسے راضی رکھنے کے لیے روح کی سہولت کاری کی جائے۔ اگر روح کی شادمانی کا اہتمام نہ ہو تو یہ موقع پاتے ہی قفسِ عنصری سے پرواز کر سکتی ہے۔ یہ روح کا مہمان رخصت ہو جائے تو یہ سراپائے خاک سرزمین پر زائد و زشت محسوس ہونے لگتا ہے۔ اس باب کے آخری تہائی حصے میں تعلقِ روح و بدن کو ایک مہلت بتا کر اس دولت کو عمل سے زیبائش کرنے کا کہا گیا ہے۔ بقول علامہ محمد اقبالؒ:۔

؎ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے(۱۵)

جسم کی کائنات میں دل کی مرکزیت اور روح [illegible] کو اصل مظہر بنایا گیا ہے اور خاکی بدن [illegible] کیا گیا ہے [illegible] کی تعبیر لی گئی ہے [illegible]
لڑکی برات کے آنے تک بابل کے گھر شہزادی ہوتی ہے اور بعد ازاں اسے پیا گھر بس جانا ہوتا ہے، اسی طرح آدمی دنیا کے عارضی پڑاؤ میں چہکتا ہے [illegible]
ہے۔ دلھن کی رخصتی کا استعارہ استعمال کر کے موت کو خوش نما بنایا گیا ہے۔ جس طرح جوان مٹیار کی جوانی کا کلائمکس ڈھولی اور پالکی کی روانگی سے منسوب ہے۔ اس طرح عالم بشریت کا کلائمکس دنیا سے حالتِ سرخ روئی میں روانگی سے ہے۔ اس حوالے سے مشتاق عاجز یوں رقم طراز ہیں:۔

تن ماٹی کا کچا کوٹھہ (کوٹھا)، روح کنواری نار
چل ری گوری دیس پیا کے، لینے آئے کہار (۱۶)

اس حوالے سے یہ شعر بھی ملاحظہ ہو جو دراصل اپنے اندر، حقیقتِ مرگِ بدن کا مفہوم لیے ہوئے ہے:۔

بابل کا گھر چھوڑ کے گوری سنگ پیا کے جا
پریتم تو ہے لینے آئے پریت کی ریت نبھا (۱۷)

❖ مادیت پرستی کا سراب:۔

مادہ اور اس سے وابستہ خصوصیات کچھ ایسا تانا بانا بنتے ہیں کہ انسان ایک معصوم پرندے کی طرح اس دام میں جا پھنستا ہے اس کی حقیقت ہر سچے عارف نے کسی نہ کسی پیرائے میں واضح کی ہے، مقصد یہ ہے کہ دنیا کا دشوار گزار آزمائشی سفر بہ خیر و خوبی اپنی درست منزل سے ہم کنار ہو اور ناکامی و نامرادی سے بچا جائے۔ ''سب مایا ہے، سب ڈھلتی پھرتی چھایا ہے''، کے مصداق سپورن کا تیسرا باب بھی دنیاوی ٹھاٹھ باٹ کو ایک دھوکا بتاتا ہے، جب جسم بھی کسی اور کی امانت ہے اور حواس بھی کسی کی دین ہیں تو انسان کس بات پر اترا رہا ہے۔
جسمانی اور نفسانی آسودگی کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے گئے، مگر، جہان بھر کی دھن دولت سمیٹ کر بھی خواہش کا بے انت خلا پُر نہیں ہو سکا۔ اس باب کا ہر دوہا یہی بھاشن لیے ہوئے ہے کہ زیادہ کمانے کی لالچ جھوٹ اور فریب کے میزان میں تولی جاتی ہے مگر اس عارضی پڑاؤ سے لاد چلنے کا وقت آنے میں دیر نہیں لگتی۔ بہتر یہی ہے کہ زندگی کا دن شام کے انجام سے پہلے پہلے سنوار لیا جائے تو سرخ روئی ہے ورنہ روسیاہی۔ درس یہ بھی دیا گیا ہے کہ آدمی دستیاب حلال کی روزی سے پیٹ کی آگ بجھائے تو سکون پا سکتا ہے، مگر زیادہ کھانے کے چکر میں دوسروں کا استحصال کر کے چین نصیب نہیں ہوتا، حرام کی دولت جتنی کمالی جائے مگر، اعمالِ خیر کی کمائی حقیقتاً سکون بخش ہے۔ مشتاق عاجزؔ اس حوالے سے یوں کہتے ہیں:۔

روح سوکھی کھائے نردھن اور کرے آرام
جس نے مال کھایا پرایا، اس کی نیند حرام (۱۸)

اس باب میں چند دوہے اشرافیہ کے خلاف پرولتاریہ کی آواز بن کر شامل ہوئے ہیں، خدمت گزار اور مزدور طبقے کا خیال نہ رکھنے پر افسوس کا اظہار کیا گیا ہے۔ مزدور کسان اور ہاری اگر محنت کے زمین آباد کرتے ہیں تو حیرت کا مقام ہے کہ ان کے اپنے بچے وافر خوراک پوشاک سے محروم رہتے ہیں۔ زمین دار اور وڈیرے اپنے کسانوں پر دست درازی کرنے سے نہیں چوکتے، حال آں کہ وہی لوگ ان کی دنیا سنوارتے ہیں، خادم اور نوکر چاکر بڑے گھرانوں کے تمام بھید جانتے ہیں مگر نمک حلالی کرتے ہوئے اپنے مالکوں کا بھرم قائم رکھتے ہیں اور پھر بھی ان کے طعنے سہتے ہیں۔ بقول مشتاق عاجزؔ:۔

کشت اٹھائے نردھن، تیرے کھیت کرے آباد
اس کے بالک بھوکے بلکیں، کھائے تری اولاد (۱۹)

یا

نردھن تیری مار بھی کھائے اور سنوارے کاج
اس کو نیچ کمینہ کہتے آئے نہ تجھ کو لاج (۲۰)

بالادست اور زیرِ دست طبقے کا [illegible] دل آزاری کا باعث بتایا گیا ہے [illegible] اس باب کا [illegible] متعلق [illegible] مشتمل [illegible]
ہوئے دوہوں پر مشتمل ہے جو ایک سادھوانہ رویہ ہے۔ دنیا پرستی اور لالچ، طمع انسان پر غالب ہوں تو مومن ایک پہلو بھی چین نہیں پاتا۔ دنیا کو گناہ گار بڑھیا [illegible] سے تشبیہ دی گئی ہے جو [illegible] والوں کو لبھانے کے لیے بناؤ سبھاؤ سے باز نہیں آسکتی۔ کہیں دنیا کو چڑیل بتلایا گیا ہے جو رنگیلے بہروپ بھر کر آنکھوں کے رستے دلوں کو گمراہ کرتی ہے۔ مگر یہ عارضی چمک دمک کی وقعت کی [illegible] دنیا کو ایسی تتلی کی تمثیل میں بیان کیا گیا ہے جو جاذبِ نظر تو ہے مگر نہ جانے کتنے معصوم اپنے پیچھے لگا کر پھلواریوں میں گھومتی رہتی ہے اور کسی کے ہاتھ نہیں آتی یہاں یہ مضمون میں ضمناً موجود ہے کہ تتلی اگر ہاتھ آ بھی جائے تو اس کے دلکش پر برباد ہو جاتے ہیں اور ساری دوڑ دھوپ اکارت چلی جاتی ہے۔ گویا دنیا، ایک خوب صورت اور حسین تتلی کے مانند ہے، جس کے پیچھے اہلِ زمانہ ازل سے پڑے ہوئے ہیں لیکن، سوائے ناکامی اور افسوس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ مشتاق عاجزؔ نے اس حوالے سے بڑا خوب صورت مضمون بندھا ہے:۔

؎ رنگ برنگی تتلی دنیا، کلی کلی منڈلائے
گلشن گلشن بالک بھاگے، تتلی ہاتھ نہ آئے (۲۱)

سب سے بڑھ کر یہ کہ دنیا ایک ستم شعار جادو گرنی کی طرح ہے جو سہانے خواب دکھا کر اپنے چاہنے والوں کا جینا دو بھر کر دیتی ہے، شیر کی فطرت رکھنے والے بھی اس کے طلسم سے مجبور ہو کر بندر ناچ ناچتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر دنیا فریبی مال و متاع کے پھندے رکھتی ہے اور لالچ کے بندے نفس کے ہاتھوں اس کی سمت مائل ہوتے ہیں مگر سب توانائیاں ہار کر بھی اس دنیا کے کھیل میں سے ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا۔ یوں اسے اس گُڑ کے شیرے سے تشبیہ دی گئی ہے جو مکھی کو راغب کرتی ہے مگر نتیجتاً اسے ٹانگوں اور پروں سے جکڑ لیتی ہے اور آنے والی ہر مکھی واپس نہیں لوٹ سکتی بل کہ اس دلدل میں جذب ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس باب کا آخری دوہا نتیجہ خیزی کا حامل ہے کہ قدرت کی منشا ہے اور بدن کی ضروریات پوری کرنے کو تمام پرندے چگنے جاتے ہیں اور یہ فطرت کے عین مطابق کام ہے مگر چوکنا رہنا ہر پرندے کے لیے ضروری ہے، جو پرندہ ہر دانے پر چونچ مارنے کا عادی اور لالچی ہو جاتا ہے اسے پتہ ہونا چاہیے کہ کئی دانے انھیں پھانسنے کے لیے دیے جاتے ہیں اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کون سا دانہ چگنا، انھیں مہنگا پڑ جائے۔ دوہا ملاحظہ ہو:۔

؎ دانہ چگنے آئیں پکھیرو، چگنا ان کا کام
جو ہر دانے پر منہ مارے اس کی قسمت دام (۲۲)

❖ فنا و بقا:۔

انسان ہمیشہ سے اس غم کا شکار ہے کہ اس کو بہت کم مایہ اور نار سار کھا گیا ہے، اپنی پیدائشی کمزوریوں کو رفع کرنے کے حیلے کرتا ہے اور کائنات میں تصرف حاصل کرنے کی سعی میں لگا رہتا ہے۔ سمپورن کا یہ باب فنا اور بقا کے قضیے سے جڑے حقائق بیان کرتا ہے۔ نازک وجود، بے اعتبار سانس کے بل پر انسان کیوں کر کائناتی عوامل کا سامنا کر سکتا ہے۔ علامتی اظہار کا سلیقہ نبھاتے یہ دوہے بتاتے ہیں کہ جتنا چاہے زندگی کی دوڑ میں حصہ لیتا رہے، مگر عارضی حیات اچانک اختتام پذیر ہو جاتی ہے، جان کا پنچھی اپنے پر پھیلائے قفس عنصری سے پرواز کرنے کو پرعزم رہتا ہے اسے معلوم ہے کہ یہ پر فریب دنیا قابلِ ترجیح نہیں، بہر حال یہ حقیقت بھی بتلائی گئی ہے کہ جیون مدہوشی کے عالم میں گزاری جا سکنے والی رات نہیں ہے، بل کہ مکمل ہوش و حواس کے مستحق دن کی مہلت ہے، جو لاغرضی سے وقت کی رو کا نظارہ کرنے بیٹھ جاتا ہے اس کی تقدیر بھی گویا سو جاتی ہے، بقول غالبؔ:۔

؎ جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے (۲۳)

یعنی نفس کی سہل پسندی فقط خواب سراب میں غلطاں رہنا چاہتی ہے مگر یہ زندگی کا درست چلن قطعی نہیں، بقول مشتاق عاجزؔ:۔

؎ وقت پہ جس نے کھیتی بیجی وہ اصلی دہقان
لمبی تان سو جائے تو گھاس اُگے کھلیان (۲۴)

یا

؎ سونے کے سو گہنے پہنے سوئی سیج سجائے
سونے والی نار ابھاگن پی من کیسے بھائے (۲۵)

محولہ بالا دونوں دوہے سہولت پسندی کی عادت کو ترک کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور اسے بد نصیبی کا بنیادی سبب بتاتے ہیں۔ گزرا وقت ہاتھ نہیں آتا، جو کسان وقت کی قدر شناسی کی اور کھیتی باڑی میں کھو گیا، وہ نوازا جائے گا اور جسے لمبی تان کر سونے کی عادت پڑ گئی وہ انجام سے یوں دوچار ہو گا کہ خودرو جنگلی جڑی بوٹیاں اور گھاس پھوس سے ڈھکے ہوئے کھیت دیکھے گا۔ اسی طرح اگر سونے کے گہنے پترے زیب تن کر کے کوئی دلھن سیج سجا کر سوئی پڑی ہو تو گھونگھٹ اٹھانے کے لیے آنے والا دولھا لا محالہ ایک ناگواری محسوس کرے گا، دولھا کی تمنا تو یہ ہوتی ہے کہ جب وہ راجا کی طرح حجلۂ عروسی میں قدم رکھے تو اس کی رانی سر جھکائے اور گھونگھٹ ڈھلکائے اس کی منتظر بیٹھی ہو، مگر، خلاف توقع اسے بے سدھ بدھ سویا دیکھ کر وہ پہلا تصور ہی بے زاری اور گریز کا جمالیتا ہے۔ زندگی کے تمام معاملات میں یہی اصول کارفرما ہے کہ انسان کی عدم توجہی اس کی بے نصیبی کو دعوت دیتی ہے انسان خواب ضرور بنتا رہے مگر تعبیر کی آرزو، عزم و ہمت سے جگائے رکھے گا تو بات بنے گی۔ زندگی کو ایک سفر قرار دیا جاتا ہے اور اس لحاظ سے اس سے منسلک تمام مصائب کو غریب الوطنی اور راہ گیری کے مسائل سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

اجیارے میں راہ سفر کی جلدی سے کٹ جائے
شام ڈھلے جو چلے مسافر پگ پگ ٹھوکر کھائے(۲۶)

دن کی روشنی سے فائدہ اٹھانا ہو تو وقت پر اپنے سفر کا آغاز سود مند ہوتا ہے، دن ڈھلنے میں شام کی تاریکی چھا جانے میں زیادہ دیر نہیں ہوتی، دن کی توانا روشنی کے تازہ پہر گنوا دیے جائیں اور پھر رختِ سفر باندھا جائے۔ تو عین ممکن ہے کہ اندھیروں میں مشکلات بڑھ جائیں، اسی طرح جو کام جس وقت پر واجب اور ضروری ہے اسے بر وقت اقدامات میں لایا جانا چاہیے۔ جس عمل کے ثمرات کل وصول کرنا چاہیں اسے آج کے مقررہ وقت پر شروع کر لیں تب ممکن ہے۔ انسان کو تقدیر کی الجھن شروع سے پریشان کیے رکھتی ہے۔ سادہ لوح آدمی ہر ایک شے اور امر کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر، دورِ شادمانی کا انتظار کرتا ہے اور حالات ناساز ہوں تو اسے بھی بخت کا لکھا سمجھتا ہے، حال آں کہ یہ درست رویہ نہیں۔

ریکھاؤں میں کیا رکھا ہے، مڑ مڑ ریکھ نہ دیکھ
ریکھا تیری مٹھی میں ہے لکھ لے اپنے لیکھ(۲۷)

اگر دیکھا جائے تو مقدر کوئی زیادہ غیر متغیر عامل نہیں ہے، بل کہ آدمی کے دستِ اختیار میں ہے وہ معاملہ روا رکھے گا، ویسا ہی نتیجہ اس کے سامنے آئے گا۔ بیم و رجا کے کھیل میں حوصلہ اور ہوس و غضب کی ابتلا میں ضبطِ نفس سے کام لیا جائے اور مالک سے اپنا تعلق راست رکھا جائے پھر زندگی، خوش و خرم اور پر سکون گزرتی ہے۔ مشتاق عاجز نے زندگی کے ان دکھ سکھ اور بیم و رجا کے حوالے سے بڑی خوب صورت سے کہا ہے:۔

دکھ سکھ جیون کے دو موسم، دکھ بھی ہنس کر جھیل
دکھ جھیلے سو جم کر کھیلے آس نراس کا کھیل(۲۸)

مشرقی ادب میں فلسفۂ وحدت الشہود اور فلسفۂ وحدت الوجود کا تذکرہ عام ملتا ہے، اردو کے قدیم شعرا نے ان دونوں فلسفوں کا استعمال اپنی شاعری میں جا بجا کیا ہے۔ مشتاق عاجز کے درج ذیل دوہے میں فلسفہ وحدت الوجود، کا مضمون نمایا ہے۔ گویا، آپ کا سمپورن میں شامل یہ دوہا نظریۂ ہمہ اوست کا پرچارک ہے:۔

ساگر سے بھر لائے گاگر، بادل جل برسائے
جل ندیا میں، ندیا آخر ساگر میں مل جائے(۲۹)

مالک و مزدور کا ناتا درزن اور سوئی کے تعلق سے بتایا گیا ہے کہ کام سر انجام کوئی دیتا ہے اور ٹھاٹ باٹ کسی کی بنی رہتی ہے، یہ ازل سے ہو رہا ہے، اس بات سے ہر حساس اور باشعور انسان متاثر ہوتا ہے۔ مزدور کی محنت کا صلہ مالک حاصل کرتا ہے اور مزدور کو اس حد تک مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ تاعمر اپنے مالک کا غلام بن کر رہے، اس کے اندر سے انا کے عناصر کا مکمل طور پر خاتمہ کر کے، مالک نہ صرف اس پر حکومت کرتا رہتا ہے بل کہ مالک کی اولاد مزدور کی اولاد پر حکمرانی کرتی رہتی ہے۔ یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہتا ہے، مشتاق عاجزؔ نے بھی معاشرے کی اس مسئلے کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:۔

سئے ہر وئے سوئی دھاگہ، درزن مانگے دام
کشٹ اٹھائے نوکر چاکر، ٹھاکر کو پر نام(۳۰)

قیادت کا وسیلہ زندگی کے لیے [illegible] گیا ہے جیسے دھاگہ سوئی کے توسل سے ٹانکے لگاتا ہے [illegible] کشتی اس کی [illegible] پار لگتی ہے [illegible]
ہدایت اور رہ نمائی کی طالبگار ہے، استاد کے بغیر استادی نہیں سیکھی جا سکتی:۔

ے جیون گہرے سا گر جیسا، ناؤ پڑی منجدھار
بنا کھویا ڈولتی نیا کون لگائے پار (۳۱)

جود و سخا کو پھولوں کی مہک، ہوا کی خوشگوار اور سورج کی روشنی جیسے استعاروں سے سمجھایا گیا ہے نہ تو خوشبو اپنی تقسیم میں کوئی تفریق روا رکھتی ہے اور نہ ہوائیں یا روشنی، اپنی فیاضی میں کسی تخصیص کے عادی ہیں بل کہ ہر کس و ناکس ان نعمتوں سے مستفید و فیض یاب ہوتا ہے۔انسان کو ایسی سخاوت اپنانی چاہیے جس سے انسان دوسروں کی نظروں میں معتبر ٹھہرے اور خالقِ کائنات کی نظروں میں بھی سرخرو ہو۔یعنی انسان کی سخاوت صرف عزیز و اقارب تک محدود نہ ہو بل کہ عامی اور اغیار بھی اس سے مستفیض ہوں۔مشتاق عاجز اس حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:۔

ے اونچی نیچی ذات نہ دیکھے سورج اور پومان
دان پاتر کی ذات جو پوچھے وہ دانی نادان (۳۲)

ے پاپی کو بھی دان کرے تو جب جانوں اُپکار
کانٹوں سے کب دام کھینچے پھولوں کی مہکار (۳۳)

❖ پند و نصائح:۔

ہلکے پھلکے اور دل چسپ الفاظ و انداز میں سبق آموز اور عبرت انگیز گفتگو کرنا سچے سادھوؤں اور فقیروں کا شیوہ ہے۔پر لطف طرز بیان کو اگر موسیقیت کا ذریعہ بھی میسر ہو تو پڑھنے اور سننے والا اثر لیے بنا نہیں رہ سکتا۔"سمپورن" کا اگلا باب "پنجم" جس کا ذیلی باب "گیان گیتا" ہے، میں مشمولہ سارا کلام ایسے پر اثر پند و نصائح سے آراستہ ہے کہ جو اپنی مثال آپ ہے۔لالچ کو بھول پن کہہ کر اسے بات سننے کا روادار بنایا گیا ہے۔یہ ایک نفسیاتی حربہ ہے کہ کسی پر غصے اور نفرت کا اظہار کرنے کی بجائے اس سے ہم دردی دکھائی جائے، ایسا کرنے سے بات منوانی سہل ہو جاتی ہے۔انسان اپنی بساط اور ضرورت دونوں کو بھول کر زیادہ سے زیادہ کی خواہش پالتا ہے اور بالآخر مال و متاع کے ذخائر، جوں کے توں پڑے رہ جاتے ہیں اور وہ اس عالمِ فنا سے عالمِ بقا کی طرف روانہ ہو جاتا ہے، مگر اس مختصر سے عرصہ حیات میں وہ طرح طرح پاپڑ بیلتا ہے، ہر جائز و ناجائز طریقے سے رزق کمانے کا خبط ختم نہیں ہوتا، حال آں کہ، خالقِ کائنات نے اسے جو کچھ عطا کیا ہے، اسی پر اسے قناعت کرنی چاہیے، اس حوالے سے مشتاق عاجز یوں کہتے ہیں:۔

ے چڑیا جتنی چونچ ہے تیری، چڑیا جتنا پیٹ
پیٹ کی خاطر بھولے پنچھی کیا کچھ لیا سمیٹ (۳۴)

جیسا کہ، اوپر بیان کیا گیا ہے کہ زندگی کو ثبات حاصل نہیں، یہ عالمِ فنا ہے، یہاں پر جس ذی روح نے ایک بار جنم لیا، اس کو موت کا ذائقہ لازمی طور پر چکھنا ہے، مشتاق عاجز نے اس قضیۂ موت و حیات کو شام سویرے کی ایک خوب صورت تمثیل سے بیان کیا گیا ہے:۔

ے بھور بھئے گھر آنگن چھوڑا، جا نکلا کت جا
سونا آنگن باٹ نہارے سانجھ بھئی گھر آ (۳۵)

عالمِ مثال گویا، اصل گھر ہے جو اس مادی دنیا میں آئے ہوئے انسان کی یوں راہ تکتا ہے جیسے صبح دم، گھر سے نکلے ہوئے کا شام پڑنے پر گھر میں انتظار کیا جاتا ہے، قبر بھی اپنے مہمان کا انتظار کرتی ہے اور پکارتی ہے کہ اگر اندھیرے سے بچنا ہو تو روشنی ساتھ لے کے آئے، نیک اعمال جو اندھیری قبر میں روشنی دیں گے، ان کا اہتمام زندگی میں ضروری ہے۔حیاتِ ظاہری کی چمک دمک جو چند روزہ ہے، بالآخر موت نے ان دیکھے سیاہ غار میں کھینچنا ہے وہاں نیک اعمال کی ضیا کام آئی گی۔نیک اوصاف و اعمال کی دولت بانٹنے سے بڑھتی ہے، چراغ سے گویا، چراغ جل رہا ہو، جب کہ دھن دولت

ہاتھ کا میل ہے جو آج ہے کل نہ ہوگی۔ ایسی [illegible] یعنی ہے۔ ایک اور فرق یہ بتایا گیا [illegible]
دولت خود تلاش کرتی ہے کہ کوئی اسے اپنائے۔ ان مضامین اور موضوعات کو مشتاق عاجز نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ اپنے درج ذیل، ان تین دوہوں میں [illegible] ہے:

۔ پل دو پل کا ہے اُجیارا، انت ہے کالی رات
پُن ہے ایسی دیپ شِکھا جو رات کو دیوے مات

۔ پُن اور گُن کی مایا جتنی بانٹو بڑھتی جائے
ہن کی مایا، ڈھلتی چھایا، ہن پر کیا اترائے

۔ دھن دولت کو لاکھ سنبھالو، دھن کو لاگے چور
پن کی دولت لو بھی ڈھونڈے بھاگے اس کی اور (۳۶)

عبادت اور ذکر کی عادت دیکھنے سننے میں اچھی لگتی ہے مگر زبانی اور بدنی ذکر و عبادت، باطن کو بدلنے کے لیے ناکافی ہے۔ کئی عابدین کے ماتھے گِھس جاتے ہیں مگر ان کے سجدوں کی تاثیر ان کے بے قابو من کو بندگی کے دائرے میں نہیں لا سکتی۔ کیوں کہ وہ عادتاً اور دکھلاوے کی پوجا پاٹ بجالاتے ہیں، جب تک عبادت میں خشوع و خضوع نہ ہو تو بادت ایک رسم تو بن جاتی ہے مگر، اس کے اثرات، دل پر مرتب نہیں ہوتے، عبادت صرف، سر جھکانے اور ماتھا رگڑنے کا نام نہیں بل کہ اس کے لیے نیت میں خلوص اور دل میں عشقِ الٰہی کا ہونا ضروری ہے، ایسے عابدین جن کے ماتھوں پر نمازیں پڑھنے سے محراب کے نشانات تو بن جاتے ہیں لیکن ان کے دل سے بغض، کینہ، نفرت اور حسد نہیں نکلتے، اس حوالے سے مشتاق عاجز نے کیا خوب صورت دوہا کہا ہے:۔

۔ مندر مسجد ماتھا گِھس کے گیا نہ مَن کا میل
تیرتھ کے سو چکر کاٹے، رہے بیل کے بیل (۳۷)

یہ دوہا، ثابت کرتا ہے کہ مکمل توجہ اور استغراق سے اپنے مالک کے حضور پیش ہونا ہی اہم ہے۔ استحضار کے بغیر قدرت کی ثناخوانی سے حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ جب کہ تفکر سے دانائی حاصل ہوتی ہے۔ دانائی مل گئی تو ایسے ہے، جیسے بلند مرتبہ مل گیا۔ اس کی مثال ریشم کے کیڑے سے دی گئی ہے، جو رس چوسنا ترک کر کے اپنی ریاضت جاری رکھتا ہے اور پر نکال کر اڑتا ہے:۔

۔ گیانی کیڑا ریشم کا جو خول میں بیٹھے جا
رَس تیاگے اور کرے تپسیا نکلے پنکھ لگا (۳۸)

طہارت کو من کی پاکیزگی بتایا گیا ہے کہ تن بدن چاہے جتنے مرضی پاک پانی سے دھو لو مگر باطن، یعنی اندر صاف نہ ہو تو کوئی شخص اجلا نہیں مانے گا۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے چیچک زدہ اور پیپ آلود بدن پر خوش پوشاکی کا اہتمام کیا جائے جس سے جسم تو کیا چھپے گا الٹا صاف لباس پر بھی داغ نمودار ہونا شروع ہو جائیں گے۔

۔ کوڑھی پہنے اجلی ستھری عطر لگی پوشاک
تن کا کوڑھ نہ جائے، الٹے جامہ ہو ناپاک (۳۹)

ظاہر داری کا پول زیادہ دیر نہیں رہتا، جو کچھ دیر بعد عیاں ہو جاتا ہے، کوے کی دم میں مور کے پر کتنی دیر تک تبدیلی قائم رکھ سکتے ہیں۔ نرم و ملائم گفتگو من موہنی ہے اور درشت الفاظ سے اپنے پرائے سب کوفت کا شکار ہوتے ہیں، لیکن بات چیت تو سوچ کا آئینہ ہوتی ہے اور جب تک سوچ گدلی ہو گفتگو خوش گوار نہیں ہو سکتی۔ ہانڈی کی لذت تو صاف شفاف برتن ہی میں کھلتی ہے اگر برتن آلودہ ہو تو کھانے کا ذائقہ نہیں رہتا۔ بل کہ مزہ کرکرا اور بدمزہ ہو جاتا ہے۔ اگر دل میں محبوب کی سچی محبت کو جگہ دی جائے تو دل کی دنیا خوب صورت ہو جاتی ہے۔ محبوب و مقصود خود اس اندورنی حسن پر فریفتہ ہو کر من میں آن بستا ہے۔ اگر یہ کامیابی مل جائے تو اس کو بلاشبہ بڑی کامیابی سمجھا جا سکتا ہے، یعنی محبوب اگر محب کے دل میں بس جائے تو گویا کائنات کی راج دھانی مل گئی۔ دل گویا کعبہ صفت ہو گیا۔ اب تو کچھ فرق محب و محبوب نہ رہا۔ فنافی الحبیب کی منزل سے فنافی الشیخ بھی مراد ہو سکتی ہے۔ اگلہ مرحلہ فنافی الرسول اور آخری مرحلہ فنافی اللہ ہے۔ اس مضمون کو لالہ موجی رام موجیؔ نے کس خوب صورتی کے ساتھ باندھا ہے:۔

۔ دل کے آئینے میں ہے تصویر یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی (۴۰)

یہ وہ منزل ہے جب عاشق و معشوق ایک ہو جاتے ہیں، جیسا کہ امیر خسروؔ نے اپنے ایک مشہور و معروف شعر میں کہا ہے۔

؎ من تو شدم، تو من شدی، من تن شدم، تو جاں شدی
تا کس نہ گوید، بعد ازیں، من دیگرم، تو دیگری

پھر، اس منزل پر کرامات اسی لیے سرزد ہونا شروع ہو جاتی ہے کہ ایک حدیث قدسی کے مطابق، اللہ تعالیٰ، انسان کے ہاتھ پاؤں بن جاتا ہے، انسان کا ہر عمل اور ہر فعل احکامِ خداوندی کے تابع ہوتا ہے۔یعنی انسان کی مرضی جب رب کی مرضی میں مل جائے تو انسان کو اپنی مرضی کی دنیا ملنے لگتی ہے پھر تو بس زبان، ہاتھ پاؤں یا آنکھ کا اشارہ درکار ہوتا ہے اور عجیب و غریب واقعات پیش آنے لگتے ہیں۔ مشتاق عاجز نے اس خیال کو دوہے کا پیراہن یوں پہنایا ہے:۔

؎ من میں پیتم آن بسے تو من کو کعبہ جان
پی کی مرضی جان کے اپنے من کی مرضی مان(۴۱)

❖ بہار حسن ورعنائی:۔

خطہ ہند سندھ کا عوامی مزاج تصوف کے علاوہ میلے ٹھیلے اور قصائدِ حسن کی طرف راغب ہے، یہاں پنپنے والی اصنافِ سخن زبان و لحن کے تفرق کے باوصف بھی کئی یکساں پہلوؤں سے متعلق ہیں۔ یہاں کی علاقائی زبانیں، ٹپے، مصرعے، ماہیے اور دوہڑے جیسی اصناف کو جنم دے چکی ہیں اور ان سب کا بنیادی موضوع تعریف و توصیفِ حسن و جمال ہے۔ دوہے کا مزاج دراصل ہندی تہذیب اور زبان میں پروان چڑھا جس سے اسے صدیوں پرانی روایات کی بنیادیں وراثت میں میسر آئیں۔ دوہے کی عظیم الشان عمارت اپنی مضبوط اور قدیم بنیادوں پر ایستادہ ہے، جس سے اسے ایک طرف تو عمدہ تر سے عمدہ ترین اسلوب ملتا رہا اور دوسری طرف موضوعاتی تنگ دامانی کا سامنا رہا۔ بہر حال بہار حسن و جمال کا حق جیسا ہندی دوہے نے ادا کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جہاں تک موضوعاتی حدود و قیود کا تعلق ہے تو فلسفہ و منطق اور افسانویت کی گہرائیاں خود اس شوخ و شنگ صنف کے لیے جان لیوا ہیں، لہذا، ایسی وسعت جس کا تعلق عمق و عمود سے ہو، اسے دوہے کا دامن تقریباً دور رہا، البتہ افقی پھیلاؤ کا میدان اس کی توفیقی ترقی کا امکانی میدان ہے۔

نرملتا، کوملتا اور سندرتا، ہی دوہے کی بر موداتنکون ترتیب دیتی ہیں، یہیں سے دوہا جھلکتا ہے اور ناظرین و سامعین کو اپنے سحر میں لے لیتا ہے۔ زلف کی سیاہ شبی اور مکھڑے کا سنہرا سویرا، گیسو کا گھٹاٹوپ اندھیرا اور چہرے کا اجالا، جوانی کا الھڑ پن، انداز و آواز کی نزاکت اور نشیلی نظروں کا جادو، وہ چیدہ موضوعات میں جو حسن و رعنائی کی مدح میں تفصیلاً مذکور ہیں۔ مشتاق عاجز کے اگلے باب ''دھیوت'' جس کا ذیلی عنوان ''روپ سروپ'' ہے، میں مشمولہ دوہے، حسن و جمال اور زیبائی اور عنائی کے مضامین سے مملو ہیں، چند دوہے، ملاحظہ ہوں:۔

؎ پورنما سا گورا مکھڑا، بال گھٹا گھنگور
شرم سے چندا چھپ چھپ جائے دیکھ تہاری اور(۴۲)

؎ نرمل، کومل، چنچل گوری جیوں پارا بے چین
چین چرائے چنچل چتون، نیند اڑائیں نین

؎ ہونٹ گلابی، نین شرابی اور نشیلی چال
امبر ڈول نہ جائے گوری اپنا آپ سنبھال(۴۳)

؎ چاندنی کی پازیب پہن کر نکلی گھر سے نار
پگ پگ پھول کھلاتی جائے گھنگرو کی جھنکار

؎ بات کرے پھلجھڑیاں چھوٹیں بول بکھیریں باس
ہنسے تو جیسے جھرنے پھوٹیں بجھتی جائے پیاس(۴۴)

حسن کا نظارہ اور ادائے حسن کا سامنا بہت کٹھن کام ہے، ایک ایک ادا، ایک ایک اشارے میں جہانِ معانی کھل جاتا ہے۔ دیکھتی آنکھ مسحور ہو کر دیکھتی رہ جاتی ہیں اور دنیا و مافیہا سے غافل ہو جاتی ہیں۔ جمال ہر رنگ میں دل کش واقع ہوا ہے اگر حسن کا سراپا جیتی جاگتی حالت میں بے انت اداؤں کا حامل ہوتا ہے تو ایسے خوابیدہ حالت میں دیکھنے کا افسوں اور بھی بڑھ کر ہے۔

دراصل یہ طلسماتی حسن کے کرشمے دیکھنے والی ہر آنکھ پر جدا جدا کھلتے ہیں۔ایسے جلوؤں کے دیدار ین صحف ہائے قدرت ان ہی قربتوں کی ایک عد نقطۂ ماسکہ سے قائم رہتی ہے۔ایک حد سے قریب آ کر یہ جلوے عام عادات واطوار میں ڈھل جاتے ہیں۔من کے خلاؤں سے مظاہر قدرت اپنی صورت میں صرف نظر نہیں آتے بلکہ زیادہ دل کش اور دل پذیر ہو کر پیش آتے ہیں، ہر انسان کے من میں خیالی صورت، ایک خوابوں کے شہر، اک کرشماتی شخصیت، کسی ان دیکھے چمن کی خواہش اور اس نوع کی دیگر خواہشات پنپتی رہتی ہیں جو کہ صرف نارسائی اور دوری سے پڑتا ہے، سوات اور مری جیسی دل کش وادیاں یا کشمیر کے حسین و جمیل پہاڑ، تھل اور تھر یا دیگر علاقوں کے باسیوں کے ذہنوں میں ایک حسین خواب کی صورت چھائے رہتے ہیں۔مگر خود سوات، مری یا کشمیر کے باشندے ان نظاروں کی یکسانیت اور دشواریوں سے اکتائے ہوئے ہوتے ہیں۔اسی طرح پھولوں سے لدی پھلواریاں مشینی دنیا سے آنے والوں پر اور طرح کا تاثر ڈالتی ہیں، جو ان پھولوں کے نگہبان سمجھ ہی نہیں سکتے۔اسی طرح حسن کے قصیدہ نگاروں کا احوال الگ ہے کہ جب تک حقیقت میں ان کا واسطہ حسن سے نہیں پڑا ہوتا وہ کسی کے حسین و جمیل سراپے کی آب و تاب اپنے من پر یا تخیلات میں محسوس کرتے ہیں اور بہت دل سوزی سے اس کے تذکرے کرتے رہتے ہیں۔الفاظ بدل بدل کر تحسین کرتے ہیں مگر کسی بھی طرح کی رسائی میسر آ جائے تو یہ تاثرات کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔روپ سروپ سے وابستہ تمام شاعری چاہے وہ گیت ہوں، نغمے ہوں، غزل ہو یا عوامی شاعری، دراصل قربتِ حسن کی التجا پر مبنی ہوتی ہے۔ایسا اظہار کسی دل دار پیکر کو شیشے میں اتارنے کے حیلے جیسا ہے۔تعریف و توصیف اور قصیدے سے محبوب فرد کا دل لبھایا جاتا ہے جس سے اپنائیت اور قرب بڑھنے کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔

ے پریم کے میٹھے بول سے گوری من میں امرت گھول
جو گی من کے دوار کھڑا ہے، دل دروازہ کھول(۴۵)

یعنی، اس کاوش کا مآلِ کار یہی ہے کہ محب کو اپنے محبوب کے دل میں کسی طرح سے کوئی مقام و مرتبہ میسر آ جائے، اس سے مراد دل نشین کی ہم نشینی ہے، ہر فرد اپنی من مرضی سے دوستیاں اور سنگتیں ترتیب دینے کا خواہش مند ہوتا ہے اور وہ شعوری یا غیر شعوری طور سے اس کا اظہار اور اس کی تگ و دو کرتا رہتا ہے، چاہے وہ اس میں کامیاب ہو یا ناکام، یہ ایک الگ بات ہے۔

❖ **ہجر و وصال:۔**

وصال، عشق و محبت کے قصے کا ماحصل جانا جاتا ہے اور ہجر کی دوڑ دھوپ کا انجام اگر وصال کی صورت میں نہ ہو تو محبت روگ بن سکتی ہے۔اس محرومی کی کسک، وصل کی امید قائم رہنے تک تو قابلِ برداشت سمجھی جاتی ہے مگر فراقِ دائمی کی صورت میں دل کے باغیچے ویران و سنسان ہونے لگتے ہیں۔اس باب ''نکھاد'' جس کا ذیلی عنوان ''برہن بین'' ہے، کے آغاز ہی میں اس پیاس کی شدت بیان ہوئی ہے۔

ے من بگیا میں آگ لگائے پی درشن کی پیاس
جلتے جلتے بجھ نا جائے پیا ملن کی آس(۴۶)

ملن کے انتظار میں گزرتے لمحات کی تڑپ میں کوئل کے میٹھی بولی بھی شور محسوس ہوتی بتائی گئی ہے اور ساون کی رنگینیاں بھی آگ لگاتی ہیں۔کیوں کہ جوبن تو ایک گزرتے موسم کے جیسا ہے ہر پریمی چاہتا ہے کہ اس کا پریم گیت مکمل ہو جائے۔جوانی کی ہر صبح کو شام کرنا اور ہر رات کو صبح سے ملانا دشوار ہو جاتا ہے اسی سطحی شکل کو دوہے کے میٹھے بول انمول کر رہے ہیں۔درختوں کی ڈالیوں پر پھوٹتے شگوفے اور نمودار ہوتا بور، ہولی کے رنگ، دیوالی کی روشنیاں ہر چیز ساجن کی یاد میں اضافہ کرتی رہتی ہیں، یہ انتظار زیادہ طویل ہو جائے تو بالم سے شکوہ شکایت شروع ہو جاتی ہے۔ناامیدی کے بادل دل و دماغ کو آسیب کی طرح حصار میں لے لیتے ہیں اور عاشق بے خود ہو کر شکوک و شبہات میں اپنے معشوق کو بے وفا، ہر جائی اور جھوٹا قرار دینے لگتا ہے۔محبوب کے لکھے ہوئے خطوط کا متن بھی جھوٹ سچ کا آمیزہ دکھائی دیتا ہے اور اس سے تڑپ میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔کام کاج چھوڑ کر زندگی کا نصب العین پیا کا انتظار قرار پاتا ہے۔ساتھی، ہم جولی جب دل کا حال معلوم کرتے ہیں تو زبان سے پہلے آنکھیں چھلک پڑتی ہیں۔یادِ محبوب میں چاند کی چاندنی بھی جلاتی ہے۔چارپائی بھی آرام نہیں دیتی اور رات کا سماں بھی کھانے کو دوڑتا ہے۔الہڑ جوانی میں جدائی کا دکھ سہہ سہہ کر آہستہ آہستہ جوبن ماند پڑنا شروع ہو جاتا ہے۔شوخی اٹکھیلی بھول جاتی ہے اور بدن مضمحل ہو جاتا ہے۔وفا کی آخری حد یہ ہوتی ہے کہ عاشق یادِ یار میں فنا ہونے لگتا ہے اور دعا کرنے لگتا ہے کہ میں چاہے مر بھی جاؤں اور میری عمر میرے معشوق کو لگ جائے تا کہ وہ اپنی بھرپور زندگی گزار سکے۔مشتاق عاجز نے اس خیال کو اپنے دوہے میں یوں برتا ہے:۔

ے رام کرے ساجنوا کے سنگ سوتن پیت نبھائے
میں مر جاؤں موری عمریا ساجن کو لگ جائے(۴۷)

فنی تجزیہ:۔

قدیم دوہانگاروں نے چوبیس ماتراؤں میں ''دوہے'' کہے،اس طرح کے دوہوں کو ''دوہا چھند'' کا نام دیا گیا، برصغیر پاک وہند میں ''دوہے'' کا زیادہ تر یہی وزن مستعمل رہا لیکن آج بھی کافی دوہانگار اسی وزن پر دوہے کہتے ہیں،اس کے علاوہ دوہے کی بہت سی بحور اور اوزان ہیں تاہم پاکستان میں، ستائیس ماتراؤں کی بحر بر وزن ''فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فاع'' پر بیشتر دوہا نگار، دوہے لکھتے ہیں،اس بحر کا نام ''سری چھند'' ہے، یہ بحر چوں کہ مترنم اور رواں ہے اس لیے اس کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی، جہاں تک مشتاق عاجزؔ کے ''سمپورن'' میں شامل، دوہوں کا تعلق ہے، تو آپ نے بھی اپنے دوہوں کے لیے اسی بحر (سری چھند) کا انتخاب کیا ہے۔

مجموعی جائزہ:۔

الغرض! جب ہم ''سمپورن'' کا مجموعی جائزہ لیتے ہیں تو کتاب میں مشمولہ دوہے، درج ذیل فکری و موضوعاتی جہات رکھتے ہیں، توحید، کن فیکون، تصوف، سلوک و معرفت، حمد و ثنا، نعتیہ، اسوۂ حسنہ، مناجات، حقیقتِ انسان خودی، روحانیت، مٹی کی عظمت، موت و حیات، لالچ و طمع، اعمالِ نیک و بد، سکونِ قلب، دنیا کی بے ثباتی، بیم و رجا، حسن و عشق، جود و سخا، من و تو، ریاضت و عبادت، ہجر و فراق، رعنائیِ حسن یا فریبِ حسن، انتظار کی تڑپ، درد و غم، ملن کی آس، فلسفۂ کامرانی، افاقیتِ عشق، فنا فی المحبوب، فنا فی الشیخ، فنا فی الرسول، فنا فی اللہ، دنیا و آخرت، فلسفۂ وحدت الوجود اور فلسفۂ وحدت الشہود، وغیرہ۔ ان فکری اور موضاعاتی جہات کے علاوہ ''سمپورن'' میں تقریباً نوے فی صد الفاظ ہندی کے استعمال ہوئے ہیں، البتہ ''سمپورن'' کے شاعر نے ان ہندی الفاظِ مستعملہ کے ہر صفحے پر موجود دوہوں کے آخر میں اردو معانی بھی ساتھ میں دیے ہیں، جن کی وجہ سے قاری کو ان دوہوں کو سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ نیز، ''سمپورن'' میں یہ ہندی الفاظِ مستعملہ ''سمپورن'' کے شاعر (مشتاق عاجزؔ) کے ہندی زبان پر کامل دسترس کے آئینہ دار بھی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مشتاق عاجز، سمپورن، فیصل آباد، مثال پبلشرز، س: ۲۰۱۱ء، ص: ۳۶۔

۲۔ ایضاً، ص: ۳۷۔

۳۔ غالب، اسد اللہ خاں، دیوانِ غالبؔ (نسخۂ طاہر)، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، بار: دوم، س: ۱۹۶۹ء، ص: ۱۱۹۔

۴۔ غالب، اسد اللہ خاں، دیوانِ غالبؔ (نسخۂ طاہر)، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، بار: دوم، ص: ۱۱۳۔

۵۔ مشتاق عاجز، سمپورن، فیصل آباد، مثال پبلشرز، س: ۲۰۱۱ء، ص: ۳۴۔

۶۔ ایضاً، ص: ۳۸۔ ۷۔ ایضاً، ص: ۴۱۔ ۸۔ ایضاً، ص: ۴۲۔

۹۔ محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال، لاہور، خزینۂ علم و ادب، س: ۲۰۰۶ء، ص: ۵۶۵۔

۱۰۔ ایضاً، ص: ۴۰۱۔

۱۱۔ خلیق الزمان، مشہور شعر، گمنام شاعر، بھائی ودی (Bhiwadi)، کائنات پبلی کیشن، س: ۲۰۱۵ء، ص: ۴۲۔

۱۲۔ مشتاق عاجز، سمپورن، فیصل آباد، مثال پبلشرز، س: ۲۰۱۱ء، ص: ۴۵۔

۱۳۔ محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال، لاہور، خزینۂ علم و ادب، س: ۲۰۰۶ء، ص: ۲۷۹۔

۱۴۔ الطاف حسین حالی، شمس العلما، خواجہ، دیوانِ حالی، دہلی، ہمدرد پریس، س: ۱۹۵۰ء، ص: ۱۰۶۔

۱۵۔ محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال، لاہور، خزینۂ علم و ادب، س: ۲۰۰۶ء، ص: ۳۲۴۔

۱۶۔ مشتاق عاجز، سمپورن، فیصل آباد، مثال پبلشرز، س: ۲۰۱۱ء، ص: ۴۹۔

۱۷۔ ایضاً، ص: ۵۰۔ ۱۸۔ ایضاً، ص: ۵۳۔ ۱۹۔ ایضاً، ص: ۵۴۔ ۲۰۔ ایضاً ۵۴

۲۱۔ ایضاً، ص: ۵۶۔ ۲۲۔ ایضاً، ص: ۵۸۔

۲۳۔ غالب، اسد اللہ خاں، دیوانِ غالبؔ (نسخۂ طاہر)، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، بار: دوم، ص: ۱۵۶۔

ISSN 2709-3905
PISSN2709-3891

۲۴۔ مشتاق عاجز، سمپورن، فیصل آباد، مثال پبلشرز، س:۲۰۱۱ء، ص:۶۱۔
۲۵۔ ایضاً، ص:۶۱، ۲۶۔ ایضاً، ص:۶۱، ۲۷۔ ایضاً، ص:۶۲، ۲۸۔ ایضاً، ص:۶۲
۲۹۔ ایضاً، ص:۶۳۔ ۳۰۔ ایضاً، ص:۶۴۔ ۳۱۔ ایضاً، ص:۶۴۔ ۳۲۔ ایضاً، ص:۶۵۔
۳۳۔ ایضاً، ص:۶۵۔ ۳۴۔ ایضاً، ص:۶۷۔ ۳۵۔ ایضاً، ص:۶۸۔ ۳۶۔ ایضاً، ص:۶۹۔
۳۷۔ ایضاً، ص:۷۰۔ ۳۸۔ ایضاً، ص:۷۱۔ ۳۹۔ ایضاً، ص:۷۲۔
۴۰۔ فرحت احساس، غزل اس نے چھیڑی (۲)، ریختہ بکس، س:۲۰۱۷ء، ص:۲۷۵۔
۴۱۔ مشتاق عاجز، سمپورن، فیصل آباد، مثال پبلشرز، س:۲۰۱۱ء، ص:۷۴۔
۴۲۔ ایضاً، ص:۷۵۔ ۴۳۔ ایضاً، ص:۷۶۔ ۴۴۔ ایضاً، ص:۷۷۔ ۴۵۔ ایضاً، ص:۸۲۔
۴۶۔ ایضاً، ص:۸۳۔ ۴۷۔ ایضاً، ص:۹۰۔